ساختیات اور پسِ ساختیات کا اجمالی تعارف

Brief Introduction of Structuralism and Post-Structuralism

*ڈاکٹر قندیل بدر

Abstract:

Structuralism and Post Structuralism have not yet converted to Urdu Literature in a comprehensive manner. This research paper attempts to make these theories easy to comprehend. Further, in this paper ideological system of linguistics and critics of these theories has been analyzed in the light of illustrations and examples of top critics of Urdu Literature. Hopefully, this study will be helpful for the scholars of Urdu Literature in acquaintance with these theories.

Key Words: Structuralism, Post Structuralism, Urdu Literature, ideological system of linguistics.

انیسویں صدی انسانی فکری تاریخ میں ایک انتہائی زرخیز اور تحیر انگیز صدی ہے اس صدی نے قریباً ہر علم میں نابغوں کو جنم دیا جنھوں نے علوم کی سابقہ اشکال کو یک سر تبدیل کر دیا۔ کریکیگارڈ کی وجودیت ہو یا کارل مارکس کا اقتصادی نظریہ، ہیگل کی جدلیات ہو یا فرائیڈ کا تحلیل نفسی، ڈارون کا نظریہ ارتقا ہو، رسل کا تجزیاتی فلسفہ یا یورپی ادب کے شہ کار فن پارے، ان تمام ہمہ گیر فکریات نے انسانی ذہن و زندگی کے قدیم تاریخی تسلسل پر کاری ضرب لگائی جس سے ان علوم کی ارتقائی کڑیاں متزلزل ہوئیں اور ایک نا مختتم فکری انتشار نے جنم لیا۔ نئی صدی کا سورج اسی فضا میں طلوع ہوا۔ بیسویں صدی در حقیقت علم و فکریات، فلسفہ و ادبیات، سائنس و تحقیقات کی مزید ترقیات کی صدی ہے۔ اس صدی کے آغاز سے مختلف النوع علوم ایک دوسرے کے قریب آئے اور ایک دوسرے کے ٹھوس حقائق کو تبدیل کرنے لگے۔ ہر فکر و فلسفہ نے نہ صرف انسانی زندگی کی چال ڈھال بدل دی بل کہ ادب و نقد کی قدیم صورتوں کی بھی از سر نو تعمیر و تعیم کی۔

انیسویں صدی کے آواخر سے فلسفہ کا شدید مسئلہ مختلف فکری تصورات میں ربط باہم پیدا کرنا تھا۔ اکثر مفکرین متفق ہیں کہ ساختیات کا ظہور اسی ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے ہوا کہ تمام اہم

* Assistant Professor / HOD Urdu Department, Sardar Bahadur Khan Women University, Quetta

فلسفیانہ افکار میں ارتباط پیدا کر سکے۔ اسی بنا پر اسے ذہنی تحریک (Mind of Movement)۔ کا نام بھی دیا گیا۔ ساختیات نے دراصل ایک ایسے طریق کار کو جنم دیا جس نے مختلف علوم کو نہ صرف متاثر کیا بل کہ ان میں ایک ربط باہم بھی پیدا کیا۔ ساختیات کی معنوی و اصطلاحی تعبیرات پر اب تک مغرب اور ہمارے یہاں خاصی خامہ فرسائی ہو چکی ہے۔ جس کے پیش نظر ساخت (Structure) کوئی نئی اصطلاح نہیں ہے۔ اس ضمن میں گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

"ارسطو کے زمانے سے اب تک ادب میں کسی نہ کسی طور پر ساخت (Structure) کا احساس رہا ہے۔ فن پارے کی ماہیئت کی بحث کرتے ہوئے ساخت کا تصور مختلف زمانوں میں مختلف رہا ہے۔ ژاں پیازے (Jean Piaget) کا کہنا ہے کہ ریاضی، منطق، طبعیات، حیاتیات اور سماجی علوم میں ساخت (Structure) کا تصور ایک مدت سے رائج رہا ہے"(1).

یہ تو طے ہے کہ ساخت کوئی نئی اصطلاح نہیں ہے۔ بہ ہر حال فرانسیسی ساختیات کی اصطلاح میں ضرور کچھ ایسے مفاہیم موجود ہیں جس نے دیکھتے ہی دیکھتے سب کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیا وہ بھی اس حد تک کہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے بعد یہ فلسفہ سب کی نگاہوں کا مرکز بن گیا اور ساختیات کے نام سے فکر و دانش کی ایک نئی تحریک کا آغاز ہوا۔ اس اصطلاح کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر ناصر عباس نیر رقم طراز ہیں:

"ساختیات میں مرکزی عنصر ساخت ہے۔ گویا یہ ایک ایسا طریق مطالعہ ہے جو ساخت کی جستجو کرتا ہے یا ساخت کو مرتب کرتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ خود ساخت کیا ہے؟ کیا ساخت کا عام فہم تصور یعنی بناوٹ، وضع، ڈول، گھڑت اور ترکیب وغیرہ ہے یا اس کا کوئی مخصوص اصطلاحی مفہوم ہے۔ دراصل ساختیات کو ساخت کے عام فہم مطالب سے کوئی علاقہ نہیں۔ ساختیات میں ساخت ایک مختلف اور غیر عمومی اصطلاحی مفہوم کی حامل ہے"(2).

ساختیات (Structuralism) کی اصطلاح سب سے پہلے ۱۹۲۹ء میں روسی و امریکی نقاد اور ماہر السنہ رومن جیکب سن (JakobsonOsipovichRoman) نے فرڈی نینڈ ساسر (Ferdinand de Saussure) کے طریق کار کے لیے استعمال کی۔ لیوی اسٹر اس (Levi-StraussClaud) نے ساسر کے لسانی ماڈل کی رو سے ساختیاتی بشریات کی بنیاد رکھی نیز رولاں بارت (Roland Barthes)

نے ان ہی لسانی ساختیاتی بصیرتوں کے ذریعے ادب تعبیرات پیش کیں اور ساختیاتی تنقید کی کے اصول وضع کیے۔یعنی ساختیاتی فکر کا مآخذ و منبع سوئس ماہر لسانیات فرڈی نینڈ ساسر کا لسانی ماڈل ہے جب کہ متذکرہ دیگر ماہرین کی ترامیم واضافوں نے اسے ایک تحریک وفلسفہ کی شکل تفویض کی۔

ساختیات کے سلسلے میں ساسر کی حیثیت وہی ہے جو کارل مارکس، سگمنڈ فرائیڈ اور چارلس ڈارون کی بالترتیب حیاتیاتی نظریہ ارتقا، تحلیل نفسی اور مادی جدلیات کے ضمن میں ہے۔ساسر (1857ء ۔1913ء) کی عہد آفریں کتاب (Course in General linguistics) 1916ء میں اس کے انتقال کے تین سال بعد شائع ہوئی۔ یہ تصنیف اس کے تین خطبات، جو اس نے لسانیات کے حوالے سے جینوا یونیورسٹی میں دیے تھے، کے نوٹس پر مشتمل ہے۔ان نوٹس کو اس کے شاگردوں Charles Bally اور SechehayeAlbert نے ترتیب دیا ہے۔اس کتاب کا انگریزی ترجمہ 1959ء میں ہوا۔

ساسر ایک نئی طرز کے لسانی مطالعے کا موجد ہے۔وہ ایک عرصے تک تاریخی لسانیات کے مطالعے اور تدریس سے منسلک رہا غالباً اسی انہماک کے دوران اسے تاریخی لسانیات کی خامیوں کا ادراک ہوا جن کو دور کرنے کی غرض سے اس نے ساختیاتی لسانیات کی بنیاد رکھی۔اس کے باوصف تاریخی لسانیات، زبان سے متعلق بنیادی سوالات کے جوابات نہیں دیتی۔وہ کہتا ہے کہ یہ لسانی طریق زبان کے تکلمی، نحوی اور معنیاتی سطحوں پر ہونے والی تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں کے تمام ممکنہ محرکات کا بہ غور مطالعہ کرتی ہے۔زبان کی موجودہ صورت کی تشکیل میں شامل تمام عناصر اور زمانی تاریخی حوادث کا مکمل تجزیہ پیش کرتی ہے۔ لیکن تاریخی لسانیات اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہے کہ کوئی زبان لمحۂ حاضر میں مکمل ابلاغ وترسیل کے فرائض کیسے سرانجام دیتی ہے؟یوں لسانیات سائنس نہیں بن پاتی۔ چناں چہ اس نے پہلی مرتبہ زبان کے ارتقائی اور تاریخی مطالعے (Diachronic) کی بہ جائے زبان کے یک زمانی (Synchronic) مطالعے کا نظریہ پیش کیا۔وہ زبان کے یک زمانی مطالعے کو سائنسی قرار دیتا ہے۔چوں کہ اس کے لسانی مطالعے کا مرکزی نکتہ زبان کے داخلی نظام کی دریافت ہے۔یعنی اگر ماہر لسانیات، زبان کے زندہ اور مکمل ابلاغی نظام کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو اسے زبان کی تاریخیت کو دبانا چاہیے۔یک زمانیت کے اس تصور نے ساختیات اور لسانیات پر گہرے اثرات مرتب کیے جب ساسر کے لسانی ماڈل کو ثقافتی مطالعات میں برتا گیا تو ثقافتی نظام کے گرد یک زمانیت کا دائرہ کھینچا گیا۔اس نظام کی تاریخ کی بہ جائے اس کی کارکردگی کا تجزیہ کیا گیا اور یہ سمجھا گیا کہ کسی ثقافتی نظام کو برتنے والے اس کی تاریخی صورت حال کا علم

نہیں رکھتے نہ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔یوں یہ مطالعہ سائنسی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔زبان کے اسی داخلی نظام کو ساخت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

زبان کے عمل اور کارکردگی کی وضاحت میں ساسر نے زبان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک کو وہ گفتار (Parole) اور دوسرے کو گرامر (Langue) کہتا ہے۔زبان میں ایک مجرد، خود مختار اور کلی نظام موجود ہوتا ہے جسے وہ لانگ کا نام دیتا ہے۔اس کی حیثیت بنیادی ہے۔یہ بہ طور سسٹم ہمہ وقت موجود ہوتا ہے۔جب کہ ہماری تمام تر گفتگو یا کلام کرنا پارول کہلاتا ہے۔ہماری گفتار مسلسل بدلتی رہتی ہے، ہزار ہا جملوں میں ڈھلتی رہتی ہے۔مگر کوئی بھی جملہ کسی دوسرے کا ثانی نہیں ہوتا۔چند الفاظ کی مدد سے لاتعداد جملے بنائے جاسکتے ہیں۔لیکن اس تمام تر عمل میں پارول آزاد و خود مختار حیثیت کا حامل نہیں بل کہ لانگ کے مرہون منت ہے۔لانگ کو استعمال میں لائے بغیر کلام نہیں کیا جا سکتا۔لانگ کی تفہیم کے لیے ساسر شطرنج کی مثال دیتا ہے۔شطرنج کے کھیل کا ایک کلی نظام ہے جس کے تحت ہم کئی بازیاں کھیلتے ہیں اور مختلف چالیں چلتے ہیں لیکن یہ ساری بازیاں اور چالیں شطرنج کے قوانین اور گرامر کے مطابق ہوتی ہیں۔یوں شطرنجی چال پارول، جب کہ بازیوں کے کلی نظام کو لانگ کے مترادف ٹھہرایا ہے۔گویا زبان تجرید اور حقائق کا مجموعہ ہے۔لانگ کسی بھی زبان کی تجریدی ساخت ہے جو اس زبان کے بولنے والوں کے لاشعور میں مضمر اور کارفرما رہتی ہے۔یہ گرامری قوانین کی طرح ہی زبان کے ترسیلی نظام کو کنٹرول کرتی ہے جس طرح گرامر سے انحراف کرنے پر ابلاغ میں رخنہ پڑتا ہے اسی طرح لانگ کی عدم موجودگی بھی ابلاغ کو محال بنا دیتی ہے۔جب کہ لانگ اپنا اظہار پارول کے ذریعے کرتی ہے۔لانگ کو پارول ہی کے ذریعے گرفت میں لیا جا سکتا ہے یعنی لانگ اگر تجریدی ساخت ہے تو پارول اس کا ٹھوس مظہر۔لیکن اس کے باوجود پارول کی لانگ پر برتری ثابت نہیں ہوتی۔اس لیے کہ پارول کے سارے ممکنہ امکانات لانگ کے مرہون ہیں۔بہ قول ناصر عباس نیر:

"ہر ثقافتی مظہر ایک ساخت یا تشکیل ہے یہ ساخت ان اجزا اور عناصر سے مل کر بنتی ہے جنہیں نشانات، کوڈز اور کنوینشنز کہنا چاہیے مگر ساخت اپنے اجزا کا حسابی مجموعہ نہیں ہوتی ساخت کے اجزا سطح پر مگر خود ساخت تہہ نشین ہوتی ہے جس طرح تکلم یا پارول سطح پر ہوتا ہے مگر لانگ یا گرامر (گو گرامر اور لانگ میں کچھ فرق بھی ہے) مخفی ہوتی ہے"(3).

ساسر کے مطابق زبان ایک ثقافتی تشکیل ہے۔ جو کئی اجزا پر مبنی ہے۔ یہ اجزا آزاد وجود کے حامل ہیں لیکن ان کا حقیقی اور معنوی اظہار ان کے آزاد وجود کے باوصف نہیں بل کہ اس رشتے پر منحصر ہے جو ان اجزا کے مابین حائل ہے۔ یہ رشتہ مماثلت کا بھی ہے اور تفرق کا بھی۔ زبان ان نشانات کا مجموعہ ہے جو ثقافت نے بنائے ہیں۔ یہ نشانات جن اشیا کی نمائندگی کا فریضہ انجام دیتے ہیں ان سے ان کا تعلق نہ منطقی ہے نہ فطری۔ اس تعریف کا بنیادی مرکز نشان (Sign) ہے۔ ساسر سے قبل زبان بالعموم اسم دہی (Nomenclature) کی کارسازی پر مبنی عمل سمجھی جاتی تھی۔ یعنی زبان کا تفاعل محض یہی تھا کہ اسما کے ذریعے چیزوں کو اور تصورات کو پہچانے۔ ساسر نے اس خیال کو ہمیشہ کے لیے رد کر دیا کہ زبان ایسے مجموعے کا نام ہے جس کا بنیادی مقصد اشیا کو نام دینا ہے۔ اس فلسفے کے تحت یہ سوچ مضحکہ خیز ہے کہ لفظ ایسا مظہر ہے جو اشیا سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس کے مطابق لفظ محض نشان (Sign) ہے۔

ساسر نے زبان کو نشانات کا ایک منظم نظام قرار دیا۔ لفظ کو نشان یا بنیادی لسانی اکائی قرار دینے کے بعد وہ اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اس کے مطابق ہر لسانی نشان کی دو اطراف ہوتی ہیں ایک کو وہ دال (Signifier) یعنی معنی نما کہتا ہے اور دوسری کو مدلول (Signified) یعنی تصور معنی قرار دیتا ہے۔ کوئی بھی بولا یا لکھا ہوا لفظ دال ہے جب کہ مدلول اس شے کا تصور ہے جس کے لیے دال وضع کیا گیا ہے۔ جب کہ خود شے (Referent) ہے۔ یعنی پھول دال، پھول کا تصور مدلول اور جب کہ خود پھول شے۔

لفظ (Word) = شے (Thing)

کے پرانے تصور کو ساسر نے اس لسانی ماڈل کے ذریعے رد کر دیا۔

نشان (Sign) = معنی نما / (Signifier) تصور معنی (Signified)

نشان کی اس دو طرفی تقسیم سے زبان کے دورخی تضاد (Binary Opposition) کو دکھایا گیا ہے۔ زبان کی اس دورخی کردار کی حیثیت آفاقی ہے۔ معنی دراصل معنی نما اور تصور معنی کے درمیان معلق ہوتا ہے۔ ویسے یہ دونوں ناقابل تقسیم ہیں، جب کوئی زبان بولی یا پڑھی جا رہی ہوتی تو لسانی نشان کی اس دوئی کو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وضاحت یہ باور کراتی ہے کہ جیسے ہم اشیا سے متعلق گفتگو سمجھتے ہیں، وہ حقیقتاً اشیا کے تصورات سے متعلق ہوتی ہے۔ جب کہ یہ تصورات یعنی سگنی فائیڈز اشیا کی محض ذہنی تصاویر ہیں نہ کہ علمی تعقلات، جو دال کی طرح فرق کی بنا پر شناخت کیے جاتے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ساسر کے اس ماڈل میں 'شے' کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ زبان میں الفاظ (لسانی

نشان یا اکائی) معنی اس لیے نہیں رکھتے کہ ان کا اشیا کے ساتھ کوئی شفاف یا اٹوٹ رشتہ ہے، بل کہ اس لیے معنی کی ترسیل کا عمل ممکنہ ہے کیوں کہ لفظ رشتوں کے جامع نظام کا حصہ ہیں۔ زبان میں معنی اس رشتے کی بدولت پیدا ہوتے ہیں۔ لفظ یا نشان اس نظام کا فقط نظر آنے والا حصہ ہوتے ہیں۔ ہم کسی نشان کو اس کی خصوصیات کی وجہ سے نہیں پہچانتے بل کہ اس فرق کی وجہ سے شناخت کر پاتے ہیں جو اس کے اور دوسرے نشانات کے درمیان موجود ہوتا ہے۔ یوں پورا لسانی نظام افتراقات کی بنیاد پر ایستادہ ہے۔

دال اور مدلول لازم وملزوم سہی لیکن ان میں موجود تعلق جبری اور مسلط کردہ (Arbitrary) ہے۔ کسی شے کے لیے جو لفظ اختیار کیا جاتا ہے وہ نہ تو اس شے کی حقیقت یا فطرت سے اور نہ ہی کسی داخلی خاصیت سے کوئی تعلق رکھتا ہے۔ یعنی لفظ اور شے کا مابین کوئی حقیقی، فطری اور منطقی تعلق موجود نہیں۔ منتخبہ لفظ اجتماعی ثقافتی عمل کی دین ہے۔ لہٰذا ایک ثقافت میں ایک ہی شے کے لیے مختلف اسما موجود ہوتے ہیں۔ صرف یہی نہیں دال اور مدلول کے مابین تعلق بھی مقامی و ثقافتی ہوتا ہے۔ ہر ثقافت اشیا کے تصورات اور ان کے معنی کا تعین اپنے اپنے قوانین کے مطابق کرتی ہے۔ اس کا ثبوت یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ ہر زبان میں کئی ایسے تصورات موجود ہوتے ہیں جو دوسری زبانوں میں نہیں ہوتے۔ کیوں کہ دوسری زبان کسی دوسری ثقافت کی زائیدہ ہوتی ہے۔

دال مدلول کے تعلق کو جبری اور ثقافتی قرار دینے کے بعد ساسر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ زبان محض ایک ہیئت ہے جو جوہر سے خالی ہے۔ جوہر کو ثبات حاصل ہے جب کہ ہیئت تغیر پذیر ہے۔ زبان کی ہیئت ثقافتی رشتوں کا ایک منظم جال ہے۔ جس میں رشتوں کی نوعیت دو طرفہ ہے۔ جن کو ساسر عمودی (Paradigmatic) اور افقی (Syntagmatic) کہتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا زبان کی اس دو طرفہ نوعیت کو ایک دائرہ کی مثال سے سمجھاتے ہیں جس میں عمودی اور افقی لکیروں کا جال سا بچھا ہے۔ اس جال کے اندر خانے ہی خانے ہیں، جو ارد گرد کے خانوں سے مل کر بنے ہیں نیز اس کا کوئی مرکز نہیں۔ ہر خانے کے خطوط دوسرے سے مستعار ہیں۔ دائرے کے اندر کوئی خانہ بھی موجود بالذات نہیں بل کہ ساتھ والے خانوں سے اپنے رشتے کی بنا پر ایک وجود رکھتا ہے۔ کسی بھی جملے میں لفظوں کی Sequential ترتیب افقی سمت کہلاتی ہے۔ اس ترتیب سے کوئی بھی جملہ با معنی بنتا ہے۔ لیکن زبان میں لفظ کا تعلق ان الفاظ سے بھی ہوتا ہے جو جملے میں وارد نہیں ہوئے، لیکن ہو سکتے تھے۔ زبان میں ہر لفظ کے کئی مترادفات اور متضادات ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کی جملے میں عدم موجودگی بھی معنی کے قیام میں عمل آرا ہوتی ہے۔ یہ

زبان کی عمودی سمت ہے۔ زبان کی کلی ساخت میں جس طرح الفاظ کی وقوع پذیری سے معنی پیدا ہوتے ہیں بالکل اسی طرح عدم وقوعی بھی معنی کی ترسیل میں برابر شریک ہے۔ الغرض زبان افتراقات کا ایک نظام ہے جس میں کوئی مثبت عنصر نہیں۔ الفاظ میں معنی کی موجودگی دراصل اس افتراق کی دین ہیں۔ یہ افتراقات بھی مطلق نہیں بل کہ روایتی اور کنونشل ہیں۔

یہ ایک غیر معمولی دریافت تھی جس نے زبان کو ثقافت سے نتھی کر دیا اور دنیا اور حقیقت سے متعلق تمام قدیم تصورات کو تہس نہس کر دیا۔ زبان ایک ثقافتی تشکیل ہے اس فلسفے نے درحقیقت صدیوں پرانے عقیدے کو نہ صرف غلط ثابت کیا بل کہ ایک نیا فلسفیانہ انقلاب بھی برپا کر دیا کہ زبان نہ تو کوئی آسمانی شے ہے نہ ہی اس دنیا کے حقائق کو متشکل کرنے والا کوئی شفاف میڈیم۔ ہم کائنات کی فقط اتنی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں جتنی زبان کے اندر موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں حقیقت ایک متن ہے جسے زبان کے وسیلے سے لکھا جاتا ہے، پڑھا جاتا ہے اور سمجھا بھی جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ناصر عباس نیر نے لکھا ہے: ''زبان یا کوڈز کا کوئی دوسرا نظام خارجی دنیا کی مادی حقیقت کو نہیں ایک ''ساختیائی گئی'' حقیقت (Structured Reality) کو پیش کرتا ہے۔ اور ہم زبان کے ذریعے دنیا کا نہیں لسانی ساخت میں لکھی گئی دنیا کا علم حاصل کرتے ہیں۔ زبان اور دنیا کے بیچ ایک پورا ثقافتی سسٹم اور Institutionalize Strategies حائل ہوتی ہیں"(4).

المختصر ماہر لسانیات ساسر کے یہی وہ معتبر خیالات ہیں جن پر لیوی اسٹراس، رولاں بارت، مائیکل فوکو، ژاک لاکان اور ژاک دریدا نے اپنے فلسفیانہ، مؤرخانہ اور ناقدانہ افکار کی بنیادیں رکھیں۔ لیکن یہاں زیادہ تر ان خیالات کو معرض بحث لاتے ہیں جو ادب اور بالخصوص ساختیاتی تنقید کے پیش رو بنے۔ ساختیاتی تنقید کا منبع و مآخذ بلا کسی شک و شبہ ساسر کی لسانیات ہے۔ یہ دبستان نقد ادب اور زبان کے رشتے کو ساسر کی لسانی ساخت اس کے فلسفیانہ اور ثقافتی مضمرات سمیت معرض بحث لاتا ہے۔ بہ ظاہر تو یہ خیال تودروف کی اس رائے کی طرح دلچسپ ہے کہ ادب زبان ہے لہذا زبان سے متعلق کوئی بھی علم ادب کی تفہیم میں کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔ وہاب اشرفی نے اس مؤقف کی وضاحت یوں کی:

''ادیب یا شاعر کی انفرادیت، شخصیت، وجدان، ذوق، التہاب، الہام، ادب یا شاعری کے حوالے کوئی اہمیت نہیں رکھتے، اس لیے کی ادیب یا شاعر کسی مخصوص نظام کا اسیر ہے وہ اس سے آگے

نہیں نکل سکتا، ادب یا شاعری کا غیر ساختیاتی جائزہ غیر سائنٹیفک اور غیر معتبر ہے۔ کسی زبان کے وسیلے سے جو نظام مرتب ہوتا ہے اسی نظام کے تحت سائنٹفک تجزیہ ممکن ہے اور وہی معتبر بھی ہے۔ شاعری یا ادب میں تجربہ کوئی چیز نہیں ہے، ہر تجربہ پہلے ہی سے ایک مخصوص نظام میں موجود ہے"(5).

لیکن یہ بات اتنی سادہ نہیں کیوں کہ رومن جیکب سن جیسے ساختیاتی نقاد بھی اس نکتے پر متفکر دکھائی دیتے ہیں۔ کیوں کہ ادب کی زبان اور عام روز مرہ یا دیگر علوم کی زبان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ زبان سے متعلق علوم زیادہ تر صرفی، نحوی اور معنیاتی دوائر تک محدود ہوتے ہیں لہذا ادبی اسالیب کو مکمل گرفت میں لینا ایک مشکل امر ٹھہرتا ہے۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ دبستان ساسر کے سائنسی طریق کا کا نمائندہ اور ادب اور سائنس دو متضاد اطراف۔ لہذا ادب اور لسانیات کا رشتہ اتنا آسان اور واضح نہیں جتنا پہلے تعارف میں معلوم ہوتا ہے۔

رومن جیکب سن کے مطابق جب تک لسانیات زبان کی بیرونی ساخت یعنی گرامر وغیرہم تک محدود ہو، ادب کی شعریات کی تفہیم میں کارآمد نہیں۔ مگر جہاں یہ زبان کے معنیاتی دائرے میں یا داخلی ساخت میں داخل ہوتی ہے وہاں نہ صرف ادب کی شعریات کی دریافت و بازیافت کرتی ہے بل کہ تجزیہ اور رہنمائی کا کام بھی سرانجام دیتی ہے۔ ادب کو زبان قرار دینے کے بعد اس کی ساخت کی یافت کی گئی ، جس میں لانگ سے مماثل خاصیت کو شعریات کا نام دیا گیا۔ یعنی شعریات بھی ادب کے پس منظر میں رہ کر ایک عام متن میں ادبیت کو قائم کرتی ہے۔ اسی کے باوصف کوئی تحریر ادب کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ یوں ساختیاتی تنقید بھی روسی فاملزم اور نئی تنقید کی طرح متن اساس دبستان بنتا ہے۔ ان دبستانوں کو اس کا پیش رو بھی کہا جا سکتا ہے۔ تاہم شعریات کی تلاش اور قدر کے تعین کی بنیادیں جدا جدا ہیں۔ شعریات بھی بہ صورت لانگ ثقافت کی زائیدہ ہے۔ ادب کی تمام جہات، علامات، کوڈز اور کنونشنز ثقافت سے مستعار لیے گئے ہیں لہذا معنی کی ترسیل و ابلاغ ثقافت کا محتاج ہے۔ یوں ادب خود مختار حیثیت کا حامل نہیں بل کہ ثقافتی قوانین کا پابند ہے۔ اس طرح نئی تنقید نے جو خود مختاری ادب کو عطا کی تھی وہ ساختیاتی تنقید نے رد کر دی۔ لہذا یہ دبستان متن کے معنی کی کھوج کہ بہ جائے اس نظام کو کھوجتا ہے جس نے اسے معنی تفویض کیے ہیں۔

ساختیاتی تنقید کی رو سے ادبی متن میں معنی تو ہوتے ہیں لیکن معلق(Suspended)اور گریزپا

(Elusive) اسے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ ادب میں موجود معنی کے اوصاف اور مقام نیز افادیت اور مقاصد کیا ہیں۔ رولاں بارت کے مطابق ادب کی زبان نہ سچ ہوتی ہے نہ جھوٹ بل کہ مستند (Valid) اور غیر مستند (Non Valid) ہوتی ہے۔ چناں چہ ادبی متن اگر مربوط نشانیاتی نظام کا حامل ہے تو مستند ہے وگرنہ نہیں۔ رومن جیکب سن نے ساسر کے ارتباط اور انتخاب یا افقی اور عمودی کے اصول پر استعارے اور مجاز مرسل کا تصور اخذ کیا۔ ہر ادبی متن میں یہ دونوں عناصر کار فرما ہوتے ہیں مگر ایک غالب اور دوسرا مغلوب حالت میں۔ اگر استعارہ غالب ہو تو متن شاعری جب کہ مجاز مرسل کی غالبیت نثر کی تشکیل کرتی ہے۔ دونوں کا موضوع زندگی سے ہے لیکن نثر میں قربت جب کہ شاعری میں مماثلت کی صفت پائی جاتی ہے۔ اس فرق کے باوجود یہ دونوں ادبی تفاعل میں شامل ہوتے ہیں۔ شاعری میں کسی حد تک نثر اور نثر میں کسی حد تک شاعری شامل ہوتی ہے۔ یوں جیکب سن کی تنقید خالصتاً لسانیاتی اصولوں پر جب کہ تودروف اور بارت کی تنقید شعریات کے ثقافتی مطالعے پر مبنی ہے۔ لیکن تمام ساختیاتی نقاد انسانی شعور کو آزاد نہیں بل کہ ثقافتی نظام میں مقید تصور کرتے ہیں۔ یوں تحریر سے مصنف خود بہ خود نفی ہو جاتا ہے۔

ساختیاتی تنقید کے تمام تر خدو خال رولاں بارت کے نظریات سے روشن ہوئے ہیں۔ اس دبستان کی بنیاد فراہم کرنے اور اصول ضوابط کی تشکیل کا وہ سب سے اہم ترین حوالہ ہے۔ اس کے فکری ارتقا کو تین سطحوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں وہ لکھاری (Author) کے وجود کا قائل تھا۔ یہ اس کی تنقید کا ابتدائی زمانہ ہے۔ اپنی فکر کی اس پہلی اور ابتدائی سطح پر اس نے مصنفین کو دو طبقات میں تقسیم کیا۔ ایک کو وہ اکریونت (Ecrivant) اور دوسرے کو اکریوین (Ecrivan) کہتا ہے۔ اکریونت سے مراد وہ طبقہ ہے جو ادب کو محض ذریعہ سمجھتے ہیں، ان ادبا کو وہ 'محرر' کا نام دیتا ہے کیوں کہ یہ زبان کے حوالہ جاتی پہلو کو منعکس کرتے ہیں۔ جب کہ اکریوین جنہیں وہ 'مصنف' قرار دیتا ہے، ادب کے جمالیاتی پہلو کے پیش کار ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں 'ادب برائے زندگی' اور 'ادب برائے ادب' کی تقسیم اسی نہج کی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں جب اس نے S/Z لکھی تو مصنف کے بارے اس کے خیالات بدل چکے تھے اور وہ اس کے وجود کا انکاری ہو چکا تھا۔ نئی تنقید نے بھی مصنف کو متن سے خارج کیا تھا لیکن بارت پر ساختیات کے 'مرکز گریز' نظریے کے اثرات زیادہ پڑے۔ یہ نظریہ ہائیڈگر اور نطشے کے 'مرکز آشنا' نظریے کی رد کے ساتھ ساتھ کوانٹم طبیعات کے نظریہ بوٹ سٹریپ سے بھی بہت متاثر رہا۔ جس کی رو سے قدیم تصور Centre-Oriented کی جگہ Pattern-Oriented نے لے لی تھی۔ یعنی اب ایک سورج، ایک

مرکزہ یا ایک معنی کا تصور رد کر دیا گیا اور اس کی جگہ ایک ایسی ساخت کا تصور رائج ہوا جس کا ہر نکتہ مرکزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ نطشے کے معروف تصور 'خدا کی موت' کی پیروی میں بارت نے مصنف (Author-God) کی موت کا باضابطہ اعلان کیا۔ اس کے مطابق متن کسی بھی واحد الہیاتی یا مصنف کے تفویض کردہ معنی سے عبارت نہیں ہوتا بل کہ لکھت ایک ایسی تہ در تہ خلا ہے جس میں بہت سی تحریریں ایک دوسرے سے ٹکرا کر باہم تحلیل ہو جاتی ہیں۔

اس اعلان کے بعد کہ 'لکھت لکھتی ہے لکھاری نہیں' بارت نے لکھت کو دو اقسام میں منقسم کیا۔ ایک کو Readerly اور دوسرے کو Writerly سے تعبیر کیا۔ یہ تقسیم اول الذکر تقسیم سے مختلف نہ تھی ماسوائے اس کے کہ اب لکھاری کی جگہ لکھت نے لے لی تھی۔ اس تقسیم میں بھی بارت دوسری شکل Writerly کو پسندیدہ گردانتا ہے اور اسے 'متن' کہتا ہے۔ اسی تصور میں بارت قاری کی اہمیت اور مقام کو بھی واضح کرتا ہے۔ کیوں کہ پہلی صورت کی لکھت قاری کو ایک صارف میں جب کہ دوسری صورت تخلیق کار میں بدل دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ قاری کو بھی دو صورتوں میں منقسم کر کے اپنی فکری تثلیث کو مکمل کر دیتا ہے۔ قاری کے لیے اس نے لذت کوش (Pleasure-Seeker) اور آنند کوش (Ecstasy-Seeker) کی اصطلاحیں استعمال کیں۔ بارت کی فکری تثلیث کو یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ:

لکھاری = Ecrivant اور Ecrivan

لکھت = Readerly اور Writerly

قاری = Plaisir اور Jouissance

یہاں یہ نکتہ مد نظر رہے کہ مقدم الذکر پر موخر الذکر حصوں کو فوقیت دی گئی ہے۔ یعنی لکھاری کی مصنف صفت Ecrivan، لکھت کی متن صفت Writerly اور قاری کی آنند کوش صفت Jouissance کو برتری حاصل ہے۔ بارت کی اسی فکری تثلیث کی روشنی میں ساختیاتی تنقید کے تمام تر اوصاف اور خدوخال اجاگر ہوئے ہیں۔

پس ساختیات در اصل ساختیات کے خلاف ایک فکری بغاوت ہے۔ اسی کی دہائی میں اس تھیوری کا آغاز ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ در حقیقت یہ تھیوری ان اغلاط کی نشان زدگی کرتی ہے جو ساختیاتی فلسفے میں در آئیں تھیں۔ یوں ساختیاتی فلسفے کے انحراف کے ذریعے اپنے خدوخال متعین کرتی ہے۔ اس تھیوری سے جڑت رکھنے والے مفکرین ساختیاتی مفروضات و مقدمات کو چیلنج کرتے ہیں۔ وہ انسانی دماغ کو

وہبی قوت (Innate) اور کائناتی ساخت (Universal Structure) کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ یہ فکری رد عمل جن دو فلسفیوں کے افکار سے جنما ہے۔ وہ مائیکل فوکو (FoucultMichel) اور ژاک دریدا (Darrida Jacques) ہیں۔ ان کے علاوہ کرسٹیوا (Kristeva) اور لاوٹرڈ (Lyotord) وغیرہم نے بھی ساختیاتی فلسفے کے نقائص کو اجاگر کیا ہے۔

مائیکل فوکو بنیادی طور پر وہ مؤرخ اور فلسفی ہے جس نے سب سے پہلے ساختیات کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اس فلسفے کے معائب پیش کیے۔ اس کی فکر، تاریخ کے عمل اور اس کے تسلسل یا تواتر کی بہ جائے اس کے انقطاع اور وقفوں کا تناظر پیش کرتی ہے۔ گویا تاریخ نام ہے ٹوٹ ٹوٹ کر جڑتے رہنے کا۔ لیکن جڑنے کا یہ عمل زنجیری نہیں جیسا کہ اس سے قبل سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس تسلسل میں کئی Spaces موجود ہیں۔ اس کے علاوہ فوکو ہر علم اور نظریہ کے پس پشت قوت اور طاقت کے مرکزی کردار کو پیش کرتا ہے۔ اس کے مطابق یہ قوت اور طاقت سیاسی یا اقتصادی نوعیت سے زیادہ سماجی اور ثقافتی اداروں کی دین ہے لیکن اٹل اور جبر پر مبنی ہے لہذا اس کی بے نقابی اور تنسیخ ضروری ہے۔ دوسرا فلسفی ژاک دریدا ہے جو ہسرل (Husserl) اور ہائڈیگر (Hiedgger) کا شاگرد ہے تاہم وہ ہائڈیگر کی فکر سے زیادہ متاثر ہے اور اس کے برعکس ہسرل کے فکری جھول اور مغالطوں پر گہری نظر رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ مابعد الطبیعاتی فکر کی پوری روایت جو روسو اور ڈیکارٹ سے قدیم یونانی افکار تک محیط ہے، کا گہرا مطالعہ رکھتا ہے۔

پس ساختیاتی تھیوری جو بہ طور خاص متذکرہ بالا فلاسفہ سے ماخوذ ہے، ساسر اور لیوی اسٹراس کے ساختیاتی نظری مباحث کے مضمرات کو منکشف کرتی ہے نیز ساختیاتی اساسیت کے تصور کو مسترد کرتی ہے۔ اگرچہ ساختیات متن کو اساس اور مصنف سے علیحدہ کرتی ہے لیکن اس کے باوجود متون کی گہری اور پوشیدہ بنیاد پر مشتمل ہے۔ پس ساختیات چوں کہ معنی کے پوشیدہ میدانوں (Grounds) سے سروکار نہیں رکھتی، نہ متن کے مرکزی معنی کی قائل ہے لہذا ساختیاتی تصور مرکزیت کو رد کرتی ہے۔ یہاں متن کی حیثیت نامکمل، سوراخ دار اور تضادات کے مجموعے کی سی ہے چناں چہ معنی کی وحدت کا دعوی بے بنیاد ہے۔ نیز زبان کی متعین ساخت بھی ناقابل فہم ہے۔ یوں یہ مکتبہ فکر متن کے اندر موجود اختلافات اور افتراقات کو سامنے لاتی ہے اور معنی کے غیر مستحکم معاملات کی نشان دہی کرتی ہے۔

بیسویں صدی کے نصف ثانی میں فلسفیانی افکار اور ادبی نظریات کی اس قدر بھرمار رہی ہے کسی منضبط نظام فکر کے تحت سب کو یک جا کرنا ناممکن ہے۔ البتہ پس ساختیاتی نظریے کی مقبولیت اور اہمیت

کے باوصف اس کو اس عہد کے سب سے اہم فلسفیانہ موڑ کی حیثیت ضرور حاصل رہی ہے۔ یہاں اس عقدے کی وضاحت ضروری ہے کہ جب پس ساختیات کا ذکر کیا جائے تو اس میں کئی فلسفیانہ افکار اور نظریات کی شمولیت کا ادراک لازم ہے۔ یعنی نو آبادیات، نو تانثیت، نو مارکسیت، نو تاریخیت وغیرہم، اس تھیوری میں شامل از کار رہے ہیں۔ البتہ یہ تمام نظریات اپنا فکری نظام جس نظریے کے تحت ترتیب دیتے ہیں، وہ ژاک دریدا کا رد تشکیل (Deconstruction) ہے۔ جسے ساخت شکنی یا رد ساخت سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

دریدا نے لفظ مرکزیت (Logocentrism) کی اصطلاح کو صوت مرکزیت Phonocentrism کے متوازی ٹھہرایا۔ یوں اس نے مغربی فلسفیانہ روایت کے اس رجحان کو رد کر دیا جس کے مطابق تقریر کو تحریر پر فوقیت حاصل تھی۔ چوں کہ تقریر میں متکلم موجود ہوتا ہے لہذا معنی کی صداقت قائم ہو جاتی ہے جب کہ تحریر میں اس کی عدم موجودگی معنی کو برقرار نہیں رکھ پاتی۔ دریدا نے تحریر و تقریر کی صدیوں سے چلی آرہی اس فوقیتی ترتیب کو افتراق (Differences) سے بدل کر معنی کی موجودگی کے قدیم تصور کو پاش پاش کر دیا۔ ضمیر علی بدایونی کے بہ موجب:

"دریدا ساسیر کی ساختیات کو مغربی فلسفے کی آخری ہچکی قرار دیتا ہے۔ یعنی وہ مابعد الطبیعاتی نظام جو افلاطون، ارسطو روایت سے ہیڈیگر اور لیوی اسٹراس تک پھیلا ہوا ہے اسے دریدا مرکزیت کے نام سے پکارتا ہے۔ یہ کلام، مرکزیت نظام فکر ہمیں معنی کی دائمی موجودگی کے فریب میں مبتلا کر دیتا ہے" (6).

دریدا کی فکر، پہلا ہی وار ساختیاتی فلسفے کے اس منضبط نظام پر کرتی ہے جس کہ تحت علوم میں یا کسی بھی نوعیت کے متن میں کوئی سسٹم یا معنی یا کوئی باضابطہ تصور موجود ہوتا ہے۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے دریدا، ساسر ہی کہ تصور نشان کو بہ طور استدلال پیش کرتا ہے اور یوں پوری ساختیاتی فکر پر سوالیہ نشان لگا دیتا ہے۔ اپنے موقف کو اس نے یوں بیان کیا ہے کہ ساسر کا تصور نشان دو طرفی ہونے کا دعوی دار ہے چناں چہ معنی نما اور تصور معنی کے مابین موجود فاصلہ کا قائل ہے۔ لیکن معنی خیزی کے عمل میں اس دورخی اور فاصلے کو حائل کیے بغیر وحدت معنی پر اصرار کرتا ہے۔ در حقیقت اختلاف اسی نکتے کی پیداوار ہے۔ پس ساختیاتی دبستان کے نمائندگان کا بنیادی اعتراض یہ ہے کہ جب معنی نما اور تصور معنی میں فاصلہ موجود ہے تو کثرت کا سامنے آنا واجب ٹھہرتا ہے۔ بنیادی طور پر ساختیات اور پس ساختیات کا

امتیاز ساسر کے تصور نشان سے منتھی ہے۔ پس ساختیاتی مفکر دریدا نے دراصل نشان کی ساسری تقسیم کو الٹ دیا یعنی دال پر مدلول کو فوقیت دی۔ یوں تصور معنی کو اولیت حاصل ہو گئی۔ اس سے یہ سمجھنا قرین قیاس ہے کہ کسی لفظ کے بولتے ہی انسانی ذہن بہ یک وقت کئی تصورات کو جنم دیتا ہے جن سے کسی واحد معنی کے قیام کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔ اور اگر ان کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے تو اس کی سب صورتیں فرضی یا جبری ہیں۔ اس کے علاوہ ساسر نے معنی کے قیام میں افتراقات کے نظام کو واضح کیا تھا کہ ایک نشان دوسرے نشان سے فرق کی بنا پر معنی کو قائم کرتا ہے۔ یعنی تتلی اس لیے تتلی ہے کیوں کہ وہ جگنو، بلبل یا گلاب نہیں ہے چوں کہ ہر لفظ اپنے معنی کے لیے کسی دوسرے لفظ پر انحصار کرتا ہے اور پھر ہر دو جا لفظ کسی اور پر۔ یوں یہ ایک نا مختتم سلسلے کا آغاز ہوتا ہے جو پیہم رواں دواں رہتا ہے۔ اس لیے معنی کا التوا لازمی ہے۔ عتیق اللہ نے لکھا ہے:

"رد تشکیل کا سب سے بڑا نمائندہ ژاک دریدا ہے، جو معنی، پس معنی، معنی در معنی کے تصورات کو الٹ کر معنی رد معنی میں بدل دیتا ہے اور چوں کہ معنی، دریدا کے مفہوم میں، تعلیق ہی تعلیق ہے، التوا ہی التوا ہے، اس لیے اس کی صداقت کی نہ تو نہایت ہے اور نہ ہی وہ مطلق ہے۔ وہ کیا ہے؟ اس کی شکل کیا ہے؟ رد تشکیل ان کے جواب فراہم نہیں کرتی بل کہ سوال در سوال پر مہمیز کرتی ہے"(7).

پس ساختیاتی ادبی تنقید تھیوری بھی دریدا کے نظریے رد تشکیل سے ماخوذ ہے۔ یہ تنقید جن خطوط پر استوار ہے ان کو مختصراً یوں سمیٹا جا سکتا ہے کہ یہ دبستان متن کی ایک خاص قسم کی قرأت پر زور دیتا ہے۔ یوں ادبی تنقید کو بھی حقیقت اور معنی کے ادراک کے نئے طریقوں سے متعارف کرواتا ہے۔ اسے تجزیاتی تفتیش کے مترادف سمجھا جا سکتا ہے جو متن کو رد کرتا ہے مگر ہر رد کے بعد ایک نئے متن کا امکان کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔ معنی کی اشتقاقی جڑوں تک پہنچنے کی مہم میں ہمارا سابقہ ان مفاہیم سے بھی پڑتا ہے جو متن کے اندر کہیں بہت گہرائی میں مدفون ہوتے ہیں۔ یعنی ہر تفہیم کسی نئے معنی کو مقرر کرنے اور گزشتہ کو رد کرنے سے عبارت ہے۔ معنی رد تشکیل کے مطابق ایسی شے نہیں جیسے متن کے اندر دریافت کیا جا سکے۔ متن مصنف کے اس معنی پر بھی مشتمل نہیں ہوتا جو اس کے مافی الضمیر میں تھا یا جس کا اظہار اسے مطلوب تھا۔ بل کہ قاری وہ پیکر ہے جو معنی کو اپنے طور وضع کرتا ہے یا خلق اور فرض کر لیتا ہے۔ اس تھیوری نے پہلی مرتبہ قاری کی آزاد حیثیت کو تسلیم کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ

فیصلہ بھی صادر کیا کہ معنی متن میں نہیں قاری اور متن کا مابین موجود کش مکش اور مجادلے میں واقع ہوتے ہیں۔

نتیجہ: اختتام پر ساختیات اور رد تشکیل کے مابین فرق کی مختصر وضاحت ضروری ہے۔ ساخت ایک مستحکم اور مربوط شے ہے جب کہ رد تشکیل میں اسے ایک غیر مستحکم اور غیر مربوط عقدے کے طور پر لیا گیا ہے۔ ساختیاتی مفکرین منظم قرأت کے قائل ہیں جب کہ اس نظریے میں کسی منظم اور فیصلہ کن قرأت کی گنجائش نہیں۔ اس کے علاوہ ساختیات ایک مکمل ضابطے اور نظام کی پروردہ ہے جب کہ یہاں نہ کوئی ہیئت ہے نہ اصل الاصول۔ لہٰذا ساخت کی بہ جائے آزاد کھیل (Free Play) کا تصور رکھتی ہے۔ ہر منضبط کہانی میں اندرونی اور مخفی تضادات نیز داخلی تناؤ اور الجھاؤ کو تلاشتی ہے۔ یعنی متنوع، متصادم اور متقابل پہلوؤں کو زیر بحث لاتی ہے۔ اس کے علاوہ متن کے لغوی معنی کی بہ جائے استعاراتی سلسلے کو درست خیال کرتی ہے چناں چہ مخفی معنی کو واشگاف و بے نقاب کرنے پر مصر نظر آتی ہے۔ یوں ساختیات کے منضبط نظام کو ایک گورکھ دھندے میں تبدیل کر دیتی ہے۔

حوالہ جات

(1) گوپی چند نارنگ، ساختیات، ابتدائی باتیں، مشمولہ، ساختیات۔ ایک تعارف، مرتبہ، ناصر عباس نیر، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۱۱ء، ص ۸۷

(2) ناصر عباس نیر، جدید اور مابعد جدید تنقید (مغربی اور اردو تناظر میں)، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۴ء، ص ۷۳۔ ۷۴

(3) ناصر عباس نیر، مقدمہ، مشمولہ، ساختیات، ایک تعارف، مرتبہ، ناصر عباس نیر، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۸

(4) ایضاً، ص ۱۸

(5) وہاب اشرفی، مابعد جدیدیت، مضمرات و ممکنات، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۵۔ ۱۶

(6) ضمیر علی بدایونی، جدیدیت اور مابعد جدیت (ایک ادبی و فلسفیانہ مخاطبہ)، کراچی، اختر مطبوعات، ۱۹۹۹ء، ص ۳۳۳

(7) عتیق اللہ، رد تشکیل کے مضمرات، مشمولہ، مابعد جدیدیت۔ نظری مباحث، مرتبہ، ناصر عباس نیر، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۷۲